تحریر : پروفیسر محمد سعید شیخ
ترجمہ : جناب عاصم صہبائی

اسلام کا شارحِ عظیم ـــــ علامہ اقبال

اقبال نے اپنی تحریروں میں جدید سائنس اور فلسفے کی روشنی میں مذہب اسلام اور اس کی نشأۃ ثانیہ کا نہایت عمیق نظر سے جائزہ لیا ہے ۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیسوی صدی میں اقبال ہی واحد شخص تھا جسے ہم اسلام کا ممتاز ترین ترجمان اور مفکر کہہ سکتے ہیں ۔ اقبال کے ہم عصر مسلمان مفکرین یا وہ جن کا تعلق گزشتہ نسل سے تھا، جن میں ترکی کے نامق کمال اور ضیا گوک لپ، مصر کے محمد عبدہٗ، رشید رضا اور عبدالرزاق ، ایران کے کاظم عصر ، علامہ طباطبائی اور علی حسین رشید ، شام کے محمد کرد علی ، انڈونیشیا کے حاجی آغا سلیم اور اقبال کے اپنے ہم وطنوں میں سرسید، شبلی، امیر علی اور ابوالکلام آزاد سرِ فہرست نظر آتے ہیں ۔ بے شک ان مشاہیر نے اپنے اپنے رنگ میں اسلام کی خدمت کی ہے ۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی اسلام کی ترجمانی جدید فلسفیانہ انداز میں نہیں کی ، اور نہ ان میں سے کوئی مغربی فلسفے پر اقبال جتنی دسترس رکھتا تھا ۔ مزید برآں اقبال نے حقائق کی ترجمانی کے لیے شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا ۔ یہ انداز بھی اس کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا ۔ یہ کہتے ہوئے قطعی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کو سائنس اور فلسفے کے بدلتے ہوئے افق کی روشنی میں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کی اشد ضرورت تھی تاکہ تغیر پذیر حالات میں اقوامِ عالم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مؤثر انداز میں تعلقات استوار کیے جا سکیں ۔

یہ پوچھنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے کہ جدید سائنس اور فلسفے کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تعبیر کی کہاں تک گنجائش ہے اور کیا یہ عمل قرآن و حدیث کی روشنی میں درست ہے ؟ نیز انسان نے جو اپنے طور پر سائنس اور فلسفے کے ذریعے حقائق دریافت کیے ہیں، ان کے اور اسلامی تعلیمات کے درمیان تطابق کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ اس کا جواز کیا ہے ؟ اقبال کے ذہن میں اس تطابق و توافق کا پسِ منظر کیا تھا ۔ ایسا کرنے سے عملاً کیا نتائج مرتب ہوئے ؟ اس مضمون میں اس قسم کے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے ۔

قرآن حکیم میں عقیدہ (FAITH) اور علم (KNOWLEDGE) کے درمیان کوئی قطعی حدِ فاصل مقرر نہیں کی گئی ۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ فرد کی دینی اور دنیوی، انفرادی اور سماجی زندگی کے مابین کوئی انفصال و انفکاک نہیں ۔ قرآن حکیم میں اس امر کی طرف واضح اشارے موجود ہیں ۔ یہ کتاب بار بار پڑھی جانے والی ہے ۔ اس کے معانی وقت کے ساتھ عیاں ہوتے رہیں گے ۔ قرآن حکیم کو جہاں اور دوسرے ناموں سے پکارا گیا ہے، وہاں اس کا نام " الکتاب " بھی ہے ۔ " الکتاب " سے مراد ایسی کتاب ہے جس کی تحریر مکمل، جامع اور پیش آئند مسائل کا ساتھ دینے کے قابل ہو ۔ قرآن حکیم میں تعلیم و تعلم کو سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام حاصل ہے ۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دنیا میں جو سب سے پہلا انقلاب آیا، وہ خواندگی کے ذریعے جہالت کے خاتمے پر مبنی تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے " قلم " کی تقدیس کی قسم کھائی ہے ۔ اور قلم کو القلم کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ قرآن حکیم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ الٰہی کی پیام رسانی کے ساتھ ساتھ تعلیم کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے ۔ خود اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو یہ دعا کرنے کا حکم دیا کہ " اے میرے رب میرے علم میں مزید اضافہ فرما ۔" (قل رب زدنی علما) علم نہ صرف انسان کے وقار کو بلند کرتا ہے، بلکہ اس کا حصول فرد کی ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کی آب یاری بھی کرتا ہے اور انھیں جلا بخشتا ہے اور انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ حقائق فطرت کو اپنی گرفت میں لا سکے ۔

چنانچہ قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے کہ انسان فرشتوں سے اس لیے بھی بہتر ہے کہ وہ اشیا کو ان کے صحیح ناموں سے پکار سکتا ہے ۔ نئی اشیا کے لیے نئے نام تجویز کر سکتا ہے ۔ اشیا کو نئے نام دینے کا مطلب استقرائی تعلیم کے ذریعے تعلقات وضع کرنا ہے ۔ مذکورہ بالا معروضات سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ قرآن حکیم نے علم اور اس کے حصول کو کس قدر فضیلت بخشی ہے ۔ احادیث میں بھی حصولِ علم کے سلسلے میں بے شمار ارشادات ملتے ہیں ۔ یہ حدیث تو بہت ہی مشہور ہے : " طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة " (علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے) یہ ارشاد بھی حضورؐ کی طرف منسوب ہے ۔ " اطلبوا العلم ولو کان بالصین " (علم حاصل کرو، خواہ اس کے لیے تمھیں چین تک جانا پڑے) ۔

ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کوئی جامد مذہب نہیں ہے بلکہ اسلام

تو نام ہے ایک متحرک اور فعال مذہب کا، جس میں تحقیق و تدقیق دریافت و بازیافت اور اختیار و اجتہاد کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ قرآن اور احادیث کے بعد اجتہاد ہی وہ تیسرا سرچشمہ ہے جس کی مدد سے روزمرہ کی زندگی اور بدلتے ہوئے تقاضوں کے لیے قوانین وضوابط وضع کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے مسائل جن میں شک و شبہ کا امکان ہو قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے لیے قوانین وضوابط مرتب کرنے کا نام اجتہاد ہے۔ قرآن حکیم میں سوچ بچار پر بہت زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ کئی جگہ پر اس قسم کے ارشادات پائے جاتے ہیں: "کیا تم سوچتے نہیں؟" "آخر تم سمجھتے کیوں نہیں؟" "دلیل کیوں نہیں دیتے؟" "کیا تم بصیرت نہیں رکھتے؟" دوسرے مذہب کے لوگوں سے بحث کے دوران بھی اس بات کا حکم ہے کہ معقولیت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ دوسروں کو ہمیشہ دلائل و براہین کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسے لوگ جو دلائل سے کام نہیں لیتے اور اپنی اس استعداد کو بروئے کار نہیں لاتے، قرآن نے انھیں گونگے اور بہرے کہا ہے اور انھیں حیوان بلکہ اس سے بھی بدتر مخلوق قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ "خدا کی نظر میں ایسے لوگ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں جو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔" اس کے برعکس وہ لوگ جو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور قرآن کے معانی کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، استنباط اور استدلال کے بغیر نہ تو کسی شے کو قبول کرتے ہیں اور نہ اسے رد کرتے ہیں، قرآن نے انہیں نبیوں کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق گو وحی کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے اور اسلام کے تمام بنیادی اصول وحی ہی کے تابع ہیں، لیکن اس کے باوجود بعض مسائل کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، تاکہ لوگوں کی عقلی اور ذہنی صلاحیتیں زنگ آلود نہ ہو جائیں۔ ایسے لوگ جنھوں نے اسلامی تعلیمات میں دسترس پیدا کر لی ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ غور و فکر کے ذریعے کتاب و سنت کے مخفی گوشوں کو اجاگر کریں اور انسان کی انفرادی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کریں۔ اس سلسلے میں اسلام نے دو قسم کے اصول وضع کیے ہیں۔ پہلی قسم کے اصول تو وہ ہیں جنھیں قطعی کہا جا سکتا ہے یعنی ان میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں لیکن دوسری قسم کے اصول وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ خارجی حالات میں تغیر اور سماجی اور معاشی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ابھرنے والے نئے نئے مسائل کے ساتھ تطبیق پیدا کرنا بھی ضروری ہے اور تطبیق صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب

قوانین میں تغیر پذیری کی گنجائش موجود ہو۔ چنانچہ احادیث میں واضح طور پر اجتہاد کی اجازت موجود ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی ضرورت کے وقت صحابہ کرام اپنی اپنی بصیرت کے مطابق اجتہاد کرتے تھے۔ ایک بار جب حضرت معاذ کو یمن کا گورنر مقرر کیا گیا تو حضور نے معاذ سے پوچھا کہ "تم لوگوں کے انتظامی امور کس طرح طے کیا کرو گے؟" ——— حضرت معاذ نے جواب دیا "قرآن کی روشنی میں" حضورؐ نے دریافت فرمایا "لیکن اگر تمھیں قرآن سے رہنمائی نہ مل سکے، ایسی صورت میں کیا کرو گے"؟ حضرت معاذ نے جواب دیا: "سنت کی روشنی میں" آپ نے فرمایا: "لیکن اگر سنت سے بھی رہنمائی نہ مل سکے؟" انھوں نے عرض کیا کہ "ایسی صورت میں میں اپنی ذاتی بصیرت اور اجتہاد سے کام لوں گا" حضرت معاذ نے یہ نہیں کہا کہ میں ایسی صورت میں حضور کی خدمت میں نمائندہ بھجوا کر مشورہ حاصل کروں گا۔ نہ حضور ہی نے اس قسم کی کوئی نصیحت فرمائی، بلکہ حضرت معاذ کے جواب پر خوشنودی کا اظہار فرمایا، اور اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا: ہر قسم کی حمد و ثنا اس ذات کے لیے ہے جو جس طرح چاہتا ہے اپنے بندوں کے لیے ہدایت کا سامان پیدا کرتا ہے۔

مندرجہ بالا واقعات علم کے حصول، استدلال اور اجتہاد کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اقبال کا یہی کارنامہ ہے کہ اس نے مسلمہ طور پر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے اسلامی تعلیمات اور سائنس اور فلسفے کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرح ڈالی۔

فلسفے کا لفظ یونانی الفاظ PHILEIN اور SOPHIA سے مشتق ہے جس کا مطلب دانائی سے محبت ہے۔ عربی زبان میں فلسفہ اور دانائی کے لیے "حکمت" کا لفظ مستعمل ہے۔ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں کم از کم نو بار اور احادیث میں متعدد بار استعمال ہوا ہے۔

ولیم جیمز کے نزدیک فلسفہ ہمیں اشیا کے متعلق صاف اور واضح انداز میں سوچنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ فلسفے کے ذریعے ہم تعقلات اور خیالات کی صحت جانچتے ہیں۔ یہ اہم کام صرف فلسفہ ہی سرانجام دیتا ہے، جب کہ دوسرے علوم اس سے محروم ہیں۔ ایک اور جدید فلسفی جی ٹی ڈبلیو پیٹرک (G. T. W. PATRICK) کے خیال میں فلسفے کا کام ہماری روزمرہ زندگی کے مشترکہ تجربات اور سائنسی نتائج کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اوّل الذکر کو ہم تجرباتی تعریف کہتے ہیں، جب کہ مؤخر الذکر کو فلسفے کی ترکیبی تعریف کا نام دیا جاتا ہے۔ بہرکیف ان دونوں کا مقصد قیاسات کا مطالعہ کرنا

ہے۔ لیکن آج منطقی اثباتیت اور فلسفیانہ تجزیات کی ترقی کے باعث ہمارے دور میں فلسفہ اپنا صحیح مقام کھو بیٹھا ہے۔

قرآن حکیم کی اصطلاح "حکمت" کا مفہوم اس سے کہیں دور ہے۔ جزوی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکمت سے مراد حقائق کی کنہ تک پہنچنا اور کائنات میں انسان کے مقام کا تعین کرنا ہے۔ حکمت کا عملی پہلو یہ ہے کہ انسان باطنی صفائی اور روح کی تہذیب کے ذریعے بصیرت اور روشنی حاصل کرے اور روح و جسم کے درمیان توافق کے ذریعے اپنی سماجی زندگی میں توازن پیدا کرے۔ حکمت و فلسفہ سے مراد محض ذہنی یا عقلی برتری نہیں۔ نہ اس کا کام محض کسی ذہنی نظریے کو جنم دینا ہے بلکہ اس کا حقیقی مفہوم زندگی کے حقائق کا جذب و انجذاب ہے۔ زندگی کے نئے پہلوؤں کا سراغ لگانا۔ کائنات کے نئے افقوں کی جستجو کرنا اور پھر انھیں اپنی ذات کا حصہ بنانا یہی فلسفے کا مقصد وحید ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں دانائی اور حکمت کے متعلق ارشاد ہے۔ "ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً" (جس شخص کو حکمت اور دانائی عطا کی گئی بلاشبہ اسے بہت ہی اچھی اور نفع رساں چیز دی گئی) قرآن کا اپنے بارے میں ارشاد ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جو دانائی کی باتیں سکھاتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ دانائی مومن کی کھوئی ہوئی شی ہے۔ چنانچہ یہ جہاں سے بھی اسے ملے وہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح حدیث شریف میں آتا ہے "کاد الحکیم ان یکون نبیاً" (دانا شخص نبوت کے قریب ہوتا ہے)۔ مندرجہ بالا ارشادات حکمت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ایک اور روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حضور یوں دعا مانگا کرتے تھے۔ اے رب مجھے اشیا کے مخفی حقائق اور ان کے اصلی روپ سے آگاہ کر۔ آپؐ کی یہ دعا سراسر فلسفیانہ قسم کی تھی جو ہمیں کانٹ کے تصورِ حقیقت کی یاد دلاتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اس سے یہ نتیجہ نکال لے کہ شاید یہ قرآن اور حدیث کے فلسفیانہ رویہ کا نتیجہ تھا کہ اقبالؒ نے کانٹ کے خیالات کی تردید میں مذہب کے مابعد الطبیعیاتی امکان کے عنوان سے مقالہ لکھا تھا۔

جہاں تک قرآنی تعلیمات کا تعلق ہے سائنس کے بارے میں اس کا رویہ مثبت ہے۔ چنانچہ اقبال نے واضح الفاظ میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ اسلام کا آغاز حقیقتہً استقرائی ذہن کی ابتدا تھی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآن میں مستعمل "آیات" کے لفظ (جس کا واحد آیۃ ہے) کا مفہوم ہے کہ قرآن ایک ایسی

کھلی ہوئی کتاب ہے جس میں ایک طرف تو ہر شے بالصراحت بیان کی گئی ہے اور دوسری طرف اس میں مظاہر کائنات کے متعلق غور و فکر سے کام لینے کی دعوت دی گئی ہے۔ قرآن میں اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ لوگ کائنات کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں تاکہ انھیں خالقِ کائنات کا علم ہو سکے۔ کیونکہ یہ کائنات خدا کی ذات کی مظہر ہے۔ قرآن حکیم میں اس مفہوم کی متعدد آیات کریمہ ہیں جن میں سے چند ایک کا یہاں ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

"آسمان اور زمین کی تخلیق اور دن رات کے تغیر میں فہم و بصیرت رکھنے والوں کے لیے یقیناً کئی نشانیاں (آیات) موجود ہیں۔" (آل عمران: ۱۸۹)

"یہ وہی ذات ہے جو بادلوں میں سے بارش برساتی ہے۔ پھر دیکھو اس کے ذریعے ہم نے ہر چیز میں روئیدگی پیدا کی اور کھیتوں کو شاداب کیا جس سے ہم تہ بہ تہ دانے نکالتے ہیں اور کھجوریں پیدا کرتے ہیں اور انگور، زیتون اور انار کے ایسے باغات اگاتے ہیں جن میں سے بعض آپس میں ملتے جلتے ہیں اور بعض مختلف ہیں۔ جب ان میں سے ہر قسم کے درخت کو پھل آتا ہے تو پھلوں کے پکنے کے عمل پر غور کرو۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لیے بہت سے نشانات مخفی ہیں۔" (الانعام: ۹۹)

"وہی ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور کیا۔ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے تم دنوں اور سالوں کا حساب لگاتے ہو ..... رات اور دن کے آگے پیچھے آنے اور آسمان اور زمین کی تخلیق میں متقی لوگوں کے لیے یقیناً بہت نشانیاں ہیں۔" (یونس: ۵-۶)

"اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا، اس پر پہاڑ اور دریا بنائے اور پھر تمام اقسام کے پھلوں کے جوڑے بنائے۔ اس نے رات کو ڈھانپنے والا بنایا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، اور زمین میں کئی قسم کے قطعات ہیں جن میں انگوروں کے باغات، فصلیں اور کھجوروں کے درخت اُگتے ہیں..... ان کی آب یاری ایک ہی طرح کے پانی سے کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہم پھلوں کو نکالتے ہیں اور ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں۔ اس عمل میں اہلِ بصیرت افراد کے لیے نشانیاں موجود ہیں۔" (الرعد: ۳-۴)

"یہ وہی ذات ہے جو تمھارے لیے بادلوں سے پانی بھیجتی ہے، جس سے تم اپنی پیاس بجھاتے ہو اور اسی سے درخت نشوونما پاکر تمھارے لیے سامانِ خوراک فراہم کرتے ہیں۔ زمین سے نباتات اگتی ہیں۔

زیتون، کھجور، انگور اور دیگر اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں بھی صاحب بصیرت کے لیے ایک واضح نشانی ہے اور یہ وہی ذات ہے جس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو تمھارے لیے مسخر کیا ہوا ہے۔ اس کے حکم سے ستارے بھی تمھاری خدمت پر مامور ہیں۔ بصیرت رکھنے والوں کے لیے ان میں کئی نشانیاں موجود ہیں، اور جو مختلف قسم کی چیزیں اس نے تمھارے لیے زمین پر پیدا کی ہیں اللہ کو یاد کرنے والوں کے لیے ان میں بھی یقیناً نشانی پائی جاتی ہے۔" (النحل : ۱۰-۱۳)

"کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس عجیب طور پر پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کو کہ اسے کس طرح بلند کیا گیا۔ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ انھیں کس طرح زمین میں میخوں کی طرح ٹھونکا گیا ہے، اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔" (الغاشیہ : ۱۷-۲۲)

"کیا انھوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا جنھیں آسمان کی فضا میں مسخر کیا گیا ہے اور بجز اللہ کے انھیں کوئی نہیں تھامتا۔ اہل ایمان کے لیے یقیناً اس میں کئی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔" (النحل : ۷۹)

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنی تعلیم سراسر عقلی اور تجرباتی ہے۔ حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کیے ہوئے علم کو توہماتی یا غیر حقیقی نہیں قرار دیا گیا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کا فضل بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ اس نے انسان کو کان، آنکھ اور دل اس لیے عطا کیے ہیں کہ وہ اس کا شکر گزار ہو۔ حسی تجربات فطرت کے مظاہر کا علم حاصل کرنے میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پھلوں کے پکنے، پرندوں کے اڑنے، رات اور دن کے بدلنے اور سورج اور چاند کے طلوع ہونے کے بارے میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ یقیناً کائنات میں ایک ایسی عظیم اور طاقتور قوت موجود ہے جو یہ سب کام سرانجام دیتی ہے۔ جوں جوں ہم کائنات کی باریکیوں میں جاتے ہیں ہماری عقل خالق کائنات کی عظمت پر دنگ ہوتی جاتی ہے۔

ان حقائق کے بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق جب تک ہم اشیا کا سائنسی مطالعہ اور تجزیہ نہیں کرتے، اس وقت تک ہم ان کے رازوں سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ اشیا کی ماہیت پر غور کرنے کا یہ سادہ سا عمل اپنی نوعیت کے لحاظ سے کافی پیچیدہ اور پُراسرار ہے۔ ایک ذرّے میں الیکٹرون اور پروٹون کا وجود اور ان کی حرکات و سکنات کا سائنسی مشاہدہ کافی مشکل کام ہے اس سلسلے میں ہر دور کے حکما اور فلاسفہ خاصے الجھے رہے ہیں۔ قدیم و جدید ماہرین طبیعیات کی مشترکہ

کاوشوں سے آج غیر مبین اور نامعلوم اشیا کے اصول بھی وضع ہو گئے ہیں۔ کائنات کے بھید اور اسرار کھلتے جا رہے ہیں۔ جیسے جیسے ہم حقائق کی تہ تک پہنچتے جاتے ہیں، ہماری حیرت کی انتہا میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ہم اس ہستی کی عظمت کے ترانے گانے لگتے ہیں جس نے بڑے منظم طریق سے اس کائنات کی تخلیق کی ہے۔ یہی وہ نشانیاں (آیات) ہیں جن کے بارے میں جگہ جگہ غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ کائنات خدا کی کھلی کتاب ہے۔ مظاہر فطرت کے سائنسی مشاہدے کو ہم مقدس کتاب کے مختلف ابواب (سورۃ) کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جنھیں ہم قوانینِ فطرت کا نام دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی سنت یا عادت ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات کا علم حقیقتاً خدا کی ذات کے بارے میں خدا کی ذات سے آگہی حاصل کرنا بھی عبادت ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ اسلام مسلمان اور ایک سائنس دان کے درمیان کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھتا۔ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ اسلام اور سائنس کے درمیان کبھی کوئی کشمکش یا تنازعہ نہیں پایا گیا۔ حالانکہ عیسائیت کی تاریخ اس الزام سے بری نہیں۔

یہ قرآنی تعلیمات ہی کا کرشمہ ہے کہ سائنسی دور کے آغاز سے قبل مسلمانوں نے بہت سی اشیا کا سائنسی نہج پر مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ فلکیات، ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، جغرافیہ اور تاریخ نویسی میں خاص دسترس پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج سائنسی عمارت استوار ہو سکی ہے۔ اس پس منظر میں اقبال کی یہ بات بہت وزنی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کا آغاز ہی حقیقتاً استقرائی ذہن کی ابتدا تھی۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ مسلمان سائنس دانوں نے تحقیق و تدقیق کے لیے جو اصول وضع کیے، سائنسی تحقیق کے لیے کم و بیش آج بھی وہی اصول استعمال ہو رہے ہیں۔ اقبال نے بالکل صحیح کہا ہے کہ یہ یونانیوں کی نہیں، بلکہ عربوں کی تحقیق اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ مغربی علما نے پہلی بار سائنسی دریافتوں کے لیے استقرائی طریقے استعمال کیے۔ اقبال کے اس دعوے کی بازگشت بریفالٹ (BRIFFAULT) کی مشہور کتاب THE MAKING OF HUMANITY میں سنی جا سکتی ہے۔ بریفالٹ اس کتاب میں رقم طراز ہے:

"ہماری سائنس عربوں کی تحقیق و تدقیق کی مرہونِ منت ہے۔ انھوں نے سائنسی دور سے قبل ہی فلکیات اور ریاضیات میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ موجودہ سائنسی ترقی میں عربوں کی کاوشوں کا بڑا دخل ہے۔ یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ موجودہ سائنسی ترقی یونانیوں کی کاوشوں کی مرہونِ منت ہے۔ یہ درست ہے کہ یونانیوں نے بھی تحقیق کے میدان میں قابلِ قدر کام کیا تھا۔ لیکن ان کا طریقِ کار انتہائی غیر سائنسی تھا۔ عمیق مشاہدہ اور تجرباتی مطالعہ تو

ونانیوں کے مزاج کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ آج یورپ میں جس سائنسی ترقی کا دور دورہ ہے، اس کی بنیاد عربوں نے
ی استوار کی تھی ۔ یونانی تو تجرباتی اصولوں سے بالکل ناواقف تھے۔"

اقبال نے اسلامی تعلیمات کے فکری پہلوؤں کو سائنس اور فلسفہ سے ہم آہنگ کرنے کی جو کوشش کی ہے ،
ہ کتاب وسنت کے عین مطابق ہے۔ اقبال اس توافق وتطابق کے لیے حق بجانب تھے، لیکن کیا یہ کاوش
فلسفیانہ طور پر بھی درست ہے؟ اقبال کی فلسفیانہ فکر کا مرکز ومحور عقیدۂ توحید ہے ۔ وجودیاتی نقطۂ نظر
سے اقبال موحد (MONIST) ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ حقیقت ایک اکائی ہے، گو اس کے اظہار کے کئی مراحل
یا درجے ہیں ۔ مادہ، زندگی، ذہن انسانی بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے
تو یہ سب حقیقت واحد کے اظہار کے کئی پرتو ہیں، انھیں متعدد حقیقتیں کہنا درست نہیں ۔ جہاں تک اقبال
کے فلسفۂ علم کا تعلق ہے ہمیں دو قسم کے نظریاتِ علم میں امتیاز کرنا ہوگا ۔ ایک وہ جن کی بنا وجودیاتی مفروضات
(ONTOLOGICAL PRESUPPOSITIONS) پر ہوتی ہے اور دوسرے وہ جن کی ابتدا ایسے
مفروضات سے نہیں ہوتی ۔ اقبال کے نظریۂ علم کا تعلق مؤخر الذکر قسم سے ہے، وہ خدا کی ذات اور اس کی
وحدت پر مکمل یقین رکھتے ہیں ۔ اس طرح اقبال کا نظریۂ علم قرآن حکیم کے تتبع میں ایک ہمہ گیر نظریۂ علم ہے،
جس میں ہر قسم کے ذہنی اور عقلی تجربات کے لیے گنجائش موجود ہے ۔ حسی ادراک، استدلال، وجدان،
پیغمبرانہ وحی والہام یہ تمام پہلو ایک ہی حقیقت کے کئی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے مختلف ذرائع کا کام
دیتے ہیں ۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب انسان کو ایک ہی حقیقت کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ۔ یہ درست
ہے کہ سائنس، فلسفہ اور مذہب انسان کے ذہنی اور عقلی ذرائع پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور ان
تینوں کی زبانیں مختلف ہیں، ہر ایک کی اپنی اصطلاحیں، اپنا ذخیرۂ الفاظ اور اپنی گرامر ہے، ان کی رسائی کے
راستے بھی مختلف ہیں، لیکن یہ اختلاف محض درجہ یا سطح کا ہے، قسم یا نوع کا نہیں ۔ اہم بات یہ ہے
کہ ان میں تناقض یا تضاد نہیں ہے ۔ اقبال نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے کہ انھیں آپس
میں قدم ملا کر چلنا چاہیے، اور یہ بات منطقی طور پر نہ تو ایک مسلمان کے لیے ناممکن ہے اور نہ سائنس دان
کے لیے مشکل ۔

مسلمان کے لیے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات ضروری ہے کہ وہ اشیا کی حقیقت پر سائنسی اصولوں کے
تحت غور کرے کیونکہ مذہب کا مدعا بھی یہی ہے، حیاتیات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم اپنی شخصیت کی داخلی

وحدت اور سالمیت پر زیادہ زور دیں، تاکہ ہم سائنسی، مذہبی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر میں توافق، یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔

اقبال نے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" پر اپنی معرکۃ الآرا انگریزی کتاب کے دیباچے میں پردہ اٹھاتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے اسلام، جدید سائنس اور فلسفہ کے درمیان ربط پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنے پیشرو فلاسفہ کی تقلید کی ہے۔ اس کوشش کی ابتدا الکندی نے کی تھی، اور یہ سلسلہ اس کے وقت سے چلا آ رہا ہے کیونکہ بعد میں آنے والے فلاسفہ نے بھی اپنے عقائد کو سائنسی اور فلسفیانہ علم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

امام غزالی، ابن خلدون اور امام ابن تیمیہ اس روش سے خوش نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایسے فلاسفہ کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ تاہم اقبال نے اس بات کو شدت سے محسوس کر لیا تھا کہ بیسویں صدی کے مسلمان اپنے عقائد کو مغرب میں ہونے والی سائنسی ترقی سے منفصل نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ اقبال نے اسلام کی جو جدید ترجمانی کی ہے اور اسے سائنس اور فلسفیانہ نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ محض قیاسی یا نظریاتی نہیں بلکہ سراسر تجرباتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک یہی کوشش ایک واحد ذریعہ ہے جس سے مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ ممکن ہے اور جس سے انھیں جہالت کے اندھیرے سے نکالا جا سکتا ہے۔ اقبال نے اپنے سفرِ یورپ سے واپسی پر محسوس کیا کہ پوری دنیا کے مسلمان دوسری قوموں سے نہ صرف سیاسی لحاظ سے پیچھے رہ گئے ہیں، بلکہ دوسری قومیں زندگی کے ہر شعبے میں ان سے آگے بڑھ گئی ہیں۔ انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ ٹکنالوجی میں مسلمان قابلِ رحم حد تک غیر ترقی یافتہ تھے۔ ذہنی طور پر ان کا دیوالہ نکل چکا تھا۔ ان کی اخلاقی حالت بھی دگرگوں تھی۔ بے ہمتی، سستی، کاہلی اور بے نظمی ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بُری طرح چھائی ہوئی تھی۔ مذہب جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ان کی مادی محرومیوں کی تلافی کے لیے کافی ہے، محض رسومات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ اپنی ثقافت گم کر چکے تھے اور مغرب کی اندھی تقلید کیے جا رہے تھے، انھوں نے سوچنا ترک کر دیا تھا، اور محض غیر ملکی خیالات اور فیشن کی درآمد پر اکتفا کر لیا تھا۔ ایسے حالات میں اقبال کی صدائے دردمند ابھری جس نے نہ صرف دنیا کے مسلمانوں کو خوابِ گراں سے اٹھایا بلکہ ان میں ایک نئی بصیرت پیدا کی اور انھیں زندگی سے پنجہ آزما ہونے کی صلاحیت بخشی۔